اخبارِ اُمّت

سربراہ کانفرنس : امیدیں' توقعات

عبدالغفار عزیز

پہلی اسلامی سربراہ کانفرنس تقریباً تیس سال قبل منعقد ہوئی تھی۔ ان تیس برسوں میں اور چند روز قبل تہران میں اختتام پذیر ہونے والی آٹھویں سربراہی کانفرنس سمیت ان تمام عالمی اجتماعات میں عالم اسلام نے کیا حاصل کیا؟ اس سوال کا جواب بہت واضح اور صدمہ خیز ہے۔ کروڑوں نہیں بلامبالغہ اربوں ڈالر کے اخراجات' لاتعداد قراردادیں' میزبان ملک میں کانفرنس کی تیاریوں کا بخار' عالمی ذرائع ابلاغ میں حسب توفیق ابلاغیاتی غلغلہ اور بس۔

اس سب کچھ کے باوجود بھی امت مسلمہ کو یہ سربراہ کانفرنسیں عزیز ہیں۔ امت چاہتی ہے کہ یہ ملن ہوتا رہے' شاید کہ اس میل ملاقات کے نتیجے میں ہی عالم اسلام کی وحدت کا خواب تعبیر سے آشنا ہو جائے۔ حالیہ تہران کانفرنس کے بعد اس امید اور آرزو میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ تمام مبصرین' تجزیہ نگاروں اور اکثر شرکاے کانفرنس کے بقول یہ اب تک کی کامیاب ترین کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس میں ۱۴۲ قراردادوں کا ایک انبار منظور کیا گیا' لیکن کانفرنس ہال سے ہٹ کر دو طرفہ اور سہ طرفہ ایسی متعدد ملاقاتیں ہوئیں جن کے نتیجے میں متعدد مسائل حل ہونے کی امید پیدا ہوئی ہے۔ ان بعض ملاقاتوں میں ان سربراہان کے درمیان بھی ملاقاتیں ہو گئیں جو طویل عرصے سے آپس میں نہیں ملے تھے۔

ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ترکی اور ایران کا وہ تنازعہ ختم ہونے کی امید پیدا ہو گئی جو اب سے اٹھارہ ماہ قبل ترکی میں ایرانی سفارتکار کے اس بیان کے بعد اٹھ کھڑا ہوا تھا جو اس نے فلسطین اور القدس کے متعلق دیا تھا۔ اب دونوں ممالک نے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ عنقریب وہ دوبارہ سفارتی تعلقات قائم کر لیں گے۔ اسی طرح ایرانی تیل کی پائپ لائن ترکی سے گزار کر بحر متوسط تک پہنچانے کی بات چیت بھی دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔

ان باہمی ملاقاتوں میں مسلم ممالک کے درمیان باہمی تجارت میں اضافے پہ گفت و شنید ہوئی ہے اور

اس تجویز پر کچھ پیش رفت ہوئی ہے کہ تمام اسلامی ممالک اپنی پیداوار کا کم از کم ۶ فی صد حصہ دوسرے مسلم ممالک کو تجارت کے ذریعے ارسال کریں۔

سعودی عرب اور ایران کے درمیان وہ گرم جوشی سامنے آئی ہے جو ایرانی انقلاب کے بعد سے مفقود تھی۔ دونوں ممالک کے سربراہان نے ایک سے زیادہ مرتبہ دو طرفہ مذاکرات کیے۔ ایک دفعہ صدر محمد خاتمی نے سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ بن عبدالعزیز سے تنہائی میں ۴۵ منٹ ملاقات کی۔ کانفرنس کے افتتاحی خطاب میں آیت اللہ خامنہ ای نے تو امریکہ کے خلاف بہت سخت زبان استعمال کی، لیکن صدر خاتمی نے مغرب کے ساتھ مذاکرات کی بات کی تو سعودی ولی عہد نے فوراً ایران اور امریکہ کے درمیان ثالثی کی پیشکش کی جس کے بعد امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان نے بھی ایرانی پیشکش کا خیر مقدم کیا۔ یہ پیش رفت مستقبل میں خطے کی سیاست پہ بہت گہرا اثر ڈال سکتی ہے کیونکہ اس کانفرنس سے چند ماہ قبل تک امریکہ کی بھرپور کوشش تھی کہ ایران میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہی نہ ہو سکے کیونکہ اس سے ایران کو تنہا کرنے کی مغربی پالیسی کو شدید نقصان پہنچتا تھا۔ لیکن ایرانی سفارتکاری اور، خاص طور پر گذشتہ مارچ میں پاکستان میں سعودی ولی عہد عبداللہ بن عبدالعزیز اور ایرانی صدر ہاشمی رفسنجانی کی ملاقات سے شروع ہونے والی عرب ایران بات چیت، نے اس کانفرنس کو ممکن بنا دیا۔ اس ضمن میں ایک اہم عامل یہ بھی کارفرما رہا کہ فلسطین میں امن مذاکرات کے نام سے شروع ہونے والا صیہونی منصوبہ اس وقت مشکل ترین لمحات سے دوچار ہے۔ نیتن یاہو انتظامیہ کے ساتھ اکثر عرب ممالک اس پالیسی کو جاری نہیں رکھ سکے جو اس کے پیش رو کے ساتھ چل رہی تھی۔ اب انھی عرب ممالک نے جو صیہونی انتظامیہ سے مذاکرات، سفارتی تعلقات اور اقتصادی روابط کے حامی تھے، قطر اقتصادی کانفرنس کا صرف اس لیے بائیکاٹ کیا کہ اس میں "اسرائیلی" انتظامیہ کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس تناظر میں دیکھیں تو تہران اسلامی سربراہ کانفرنس مستقبل میں امت مسلمہ کی پالیسیوں پہ گہرے اثرات چھوڑ سکتی ہے۔ اس کانفرنس کے کامیاب انعقاد سے مغربی ایجنڈے کی دو شقیں ناکام ہو گئیں۔ امریکہ قطر کانفرنس کے ذریعے مسلم ممالک کے صیہونی انتظامیہ سے تعلقات مضبوط کرنے میں بھی ناکام رہا اور ایران سے اپنے تعلقات کو بحال کرنے سے روکنے میں بھی۔ سعودی عرب کے علاوہ بحرین، مصر، آذربائیجان، متحدہ عرب امارات اور لیبیا کے ساتھ بھی ایرانی تعلقات بہتر ہوئے ہیں۔ بحرین کے وفد کے سربراہ کو یہ یقین دہانی کروائی گئی ہے کہ بحرین میں ہونے والے مظاہروں کے پیچھے ایران کارفرما نہیں ہے۔ آذربائیجان کے ساتھ بحر خزر کے تیل کے ذخائر کے بارے میں ایک متفق علیہ پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے اور فیصلہ کیا گیا ہے کہ ایران ان ذخائر سے اپنا ۱۰ فی صد حصہ وصول کرتا رہے گا۔ متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ شیخ راشد النعیمی کے ساتھ صدر خاتمی کی ملاقات بھی شنید ہے کہ مثبت رہی اور ایران نے یہ یقین

دہانی کروائی کہ وہ امارات کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر کرنا چاہتا ہے۔ ان دو برادر ممالک کے درمیان اس امر پر تنازعہ چلا آ رہا ہے کہ آبنائے ہرمز کے قریب واقع تین جزیروں پر کس کا حق ہے؟ فی الوقت ان پر ایران کا قبضہ ہے۔ حالیہ کانفرنس میں امارات کے سربراہ شیخ زاید بن سلطان شاید اسی وجہ سے خود شریک نہیں ہوئے کہ پہلے یہ تنازعہ ختم کیا جائے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ دونوں ممالک اس ضمن میں مذاکراتی وفود تشکیل دے رہے ہیں جو عنقریب ایک دوسرے کے ممالک کا دورہ کریں گے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کانفرنس کے انعقاد سے پہلے اس طرح کے تمام تنازعات کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ایران امارات تنازعے کے علاوہ قطر و بحرین، سعودیہ و یمن، کویت و عراق اور مصر و سوڈان کے باہمی مسائل نیز امت کے بڑے مسائل: کشمیر، فلسطین، بوسنیا، الجزائر، چیچنیا کا "عملی حل" تلاش کیا جاتا۔ امت کی وحدت و ترقی اور اصلاح کا کوئی اسلامی ایجنڈا وضع کیا جاتا۔ لیبیا، سوڈان اور دیگر ممالک پر سے اقتصادی پابندیاں ہٹانے کے لیے کوئی موثر منصوبہ بندی کی جاتی۔ امت مسلمہ کو اسلامی تہذیب و ثقافت میں ڈھالنے اور مغربی تہذیب کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی ٹھوس عملی پالیسی بنائی جاتی اور پھر تمام مسلم سربراہان مل بیٹھ کر ان پالیسیوں کی نوک پلک درست کر کے انھیں پوری قوت سے نافذ کر دینے کا اعلان کر دیتے۔ کیونکہ صرف قراردادیں اور اختتامی اعلامیہ میں مسلم امت کے مسائل کا ذکر کر دینا مسائل کو حل نہیں کرتا۔

پاکستان لاکھ اعلانات کرتا پھرے کہ اس نے تہران کانفرنس میں بہت اچھی قراردادیں منظور کروالی ہیں لیکن کیا ان قراردادوں سے کشمیری مظلوموں پر توڑے جانے والے مظالم میں کوئی کمی آئے گی؟ اگر پاکستان میں کوئی مجاہد قیادت برسر اقتدار ہوتی تو تہران کے لیے صرف یہی ایجنڈا لے کر نہ جاتی کہ "قرارداد" منظور کروانا ہے، وہ کانفرنس میں مسلم ممالک کو کم از کم اس بات پہ قائل کرنے کی کوشش کرتی کہ وہ بھارت کا اقتصادی بائیکاٹ کریں۔

تہران کانفرنس کا ایک یہ پہلو بھی قابل مطالعہ ہے کہ اس میں کئی ممالک کی نمایندگی سربراہی سطح کی نہیں تھی۔ مصر کے حسنی مبارک، لیبیا کے کرنل قذافی، مراکش کے شاہ حسن الثانی (جو اسلامی سربراہی کانفرنس کے سابق صدر بھی تھے) تیونس کے زین العابدین بن علی، الجزائر کے امین زروال، سلطنت عمان کے سلطان قابوس، بحرین کے عیسیٰ آل خلیفہ، متحدہ عرب امارات کے شیخ زاید بن سلطان اور انڈونیشیا کے سوہارتو اس کانفرنس میں نہیں آئے۔ ان سربراہان میں سے جو سربراہ کسی مسئلے یا تنازعے کی وجہ سے نہیں آئے، مسلم ممالک کو وہ تنازعہ حل کرنے کی زیادہ سعی کرنی چاہیے۔

اس کانفرنس میں سوڈان کو درپیش مسائل اور اس کی اسلامی حکومت کو ملنے والی مغربی دھمکیوں کا کوئی

نوٹس نہیں لیا گیا جس سے امت کے اس تصور میں کمزوری آئی ہے کہ پوری امت ایک جسد ہے جو اپنے کسی عضو کی تکلیف پر بے چین ہو جاتا ہے۔

کانفرنس کے انعقاد ہی کے دنوں میں ترکی اور اسرائیل نے ایک بار پھر اعلیٰ سطحی مذاکرات کے ذریعے باہمی تعاون' خاص طور پر عسکری تعاون پر اصرار کیا ہے اور اس کے لیے آیندہ بیس سال میں ۱۵۰ ارب ڈالر کا بجٹ بتلایا گیا ہے' یعنی ہر سال تقریباً ۸ ارب ڈالر۔ کیا مسلم امت اپنے دشمن پر نگاہ رکھتے ہوئے یہ جائزہ لے سکے گی کہ سربراہی کانفرنس منعقد کر کے حاصل ہونے والے فوائد زیادہ ہیں' یا عملی اقدام کرتے ہوئے سربراہی کانفرنس کے بغیر ہی ۱۵۰ ارب ڈالر صرف ترکی کے خزانے سے نکلوا لینا زیادہ نقصان دہ ہے۔

ترک اسرائیلی امریکی مثلث

حامد عبدالرحمٰن الکاف

ترکی کے فوجی اور سول اسلام دشمن عناصر نے اسرائیل کے ساتھ کھلم کھلا عسکری تعاون کی پالیسی اپنائی ہے' جس کی ایک شکل فضائی اڈوں کا استعمال اور ترکی طیاروں کی دیکھ بھال (maintenance) کے معاہدے ہیں۔ ان معاہدات کا خطرناک پہلو اس وقت سامنے آیا جب اسرائیلی طیاروں نے ترکی کے فضائی اڈوں سے پرواز کر کے جنوبی لبنان پر بم گرائے۔ ۱۹۸۲ میں جب اسرائیل نے لبنان سے فوجی انخلا کا فیصلہ کیا تو اس کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ وہ جنوبی لبنان میں ایک ایسی فوجی پٹی وجود میں لائے گا جس میں لبنان کے عیسائی اور اسرائیل کے فوجی دستوں کو تعینات کیا جائے گا۔ یہ پٹی لبنان کے سمندری علاقے سے شروع ہو کر جنوبی لبنان سے گزرتی ہوئی شمال مشرق لبنان کی طرف لبنانی شامی مشترک سرحدوں سے جا ملتی ہے۔ اس طرح خود اسرائیلی فوج اور اس کے ساتھ لبنانی عیسائیوں کے فوجی دستے لبنان اور شام دونوں پر اپنا بھرپور دباؤ ڈالے ہوئے ہیں۔

اسرائیلی طیاروں کا ترکی سے پرواز کر کے جنوبی لبنان پر حملہ آور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ترکی:

(الف) دو عرب ملکوں پر جارحانہ حملوں میں اسرائیل کے ساتھ براہ راست اور برابر کا شریک ہے۔

(ب) شام اور لبنان پر اسرائیل کے فوجی دباؤ اور خطرات کو' جو جنوبی لبنانی پٹی کی شکل میں ہیں' صحیح گردانتا ہے۔

(ج) جنوبی لبنان کی مقبوضہ پٹی اور مقبوضہ جولان کے ناجائز قبضوں اور ان پر جارحانہ اسرائیلی کارروائیوں کو ترکی "قانونی" سرگرمیاں تصور کرتا ہے اور اسی بنیاد پر وہ اسرائیل کا ساتھ بھی دے رہا ہے۔

اس پر مستزاد' ترکی نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ترکی' شامی' لبنانی اور اسرائیلی ساحلوں کے سامنے اسرائیلی اور